حقوق کو مسترد کرنا نمایاں طور پر پوپ پائس ششم کی طرف سے ۱۷۸۹ء کے حقوق فرد (Rights of Man) کے فرانسیسی اعلان کو مسترد کرنے کے مساوی تھا۔ ممکن ہے کہ بہت پہلے ہم اس کا ادراک کر لیتے کہ اہل مغرب نے بھی ایسی ہی رکاوٹوں کا مقابلہ جمہوریت کی راہ پر چلنے کے معاملہ میں کیا جو ہمیں آج درپیش ہیں۔ مغرب کے شہریوں نے اپنی آزادی کے لیے جنگ کی تھی۔ اس جنگ میں نہ ان کی روح، نہ ان کا مذہب ان کے ہاتھ سے گیا۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم آزادی کی جنگ کے لیے آستینیں چڑھالیں، اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ہم سب سے پہلے آزاد اور ذمہ دار بنی نوع انسان ہیں جن کو اللہ نے توقیر عطا فرمائی۔

[ایرانی نژاد مورخہ لادن بورومانڈ، بین الاقوامی فورم برائے جمہوری مطالعات کی سابق معلمہ ہیں جنھوں نے پیرس کے ایک ادارے Ecole des Hautes Etudes en Sciences Sociales سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ موصوفہ Guerre des principles کی مصنفہ ہیں جو انقلاب فرانس کے دوران فرد کے حقوق اور قوم کی خودمختاری کے درمیان واقع ہونے والی کشیدگی پر تیار کیا گیا ایک مبسوط مقالہ ہے۔ موصوفہ کی ہمشیرہ رویابورومانڈ بھی ایرانی مورخہ ہیں، جنھوں نے ساربون (Sorbonne) سے ڈاکٹریٹ کی ہے۔ آپ ایران کی عصر حاضر کی تاریخ کی ماہر ہیں اور ادارہ برائے نگرانی حقوق انسانی (Human Rights Watch) کی ایک صلاح کار رہی ہیں۔ دونوں ایک مطالعہ انقلاب ایران پر کام کر رہی ہیں۔]

مطلق العنان شہنشاہیت بمع جمہوریت: ایک خریدیے دوسری مفت!

تحریر: اَرُون دَھتی رائے*

ترجمہ: محمد نسیم فاروقی

[اَرُون دَھتی رائے بھارت کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ علاقہ کیرالہ سے تعلق رکھنے والی دانشور ہیں۔ مغرب کی یونیورسٹیوں اور دیگر اداروں میں وہ اپنے معلومات سے پُر، بے لاگ اور غیر متعصب خطابات کی وجہ سے بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ ان کے لیکچرز بہت پسند کیے جاتے ہیں اور ان کا عوضانہ انہیں لاکھوں ڈالر کی صورت میں ملتا ہے۔ چونکہ وہ کھل کر تنقید کرتی ہیں اور مصلحت و رعایت کو آڑے نہیں آنے دیتیں، اس لیے مغربی ذرائع ابلاغ نے ان کا مقاطعہ کر رکھا ہے۔ کوئی ٹی وی اور ریڈیو اسٹیشن انہیں اپنے ہاں مدعو نہیں کرتا۔ کوئی مشہور رسالہ مثلاً ٹائمز نیویارک، ان کی تقاریر کے خلاصے نہیں چھاپتا۔ اس کے باوجود ان کی مقبولیت حدوں کو چھو رہی ہے۔ یعنی ۱۳ مئی ۲۰۰۳ء کو انہوں نے امریکہ کے سب سے بڑے شہر نیویارک کے ریور سائیڈ نامی گرجا گھر میں جو اس شہر کی غریب ترین کالوں کی بستی ہارلم میں واقع ہے، مشہور ادارے ''مرکز برائے مشیت اور سماجی حقوق (Center for Economic and Social Rights) کے زیر اہتمام منعقد کردہ تقریب میں ایک لیکچر دیا۔ یہ لیکچر جہاں معلومات سے بھرپور ہے اتنا ہی نوکیلا اور کٹیلا بھی ہے۔ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ امریکی سرزمین پر کھڑے ہو کر امریکی صدر، ان کے والد، امریکی زعما، امریکی پالیسی اور دنیا بھر میں امریکہ جو کچھ کرتا پھر رہا ہے اس پر اس قدر کڑی تنقید کرنا جہاں اروِن دھتی رائے کی ہمت و جرأت کا مظہر ہے وہاں اسے برداشت کرنا بھی امریکی ہمت اور قوت برداشت کا مظہر ہے۔ مترجم]

Arundhati Roy, Paper presented in New York City at the Riverside Church, May 13, 2003, Sponsered by the Center for Economic and Social Rights. http://www.truthout.org/docs_03/printer_051803 H. shtml

اس بھلے زمانے میں جب ہمیں صرف معلوم کرنے کے لیے کہ ہماری اور دنیا بھر کی آزادیاں کس تیزی سے ہم سے چھینی جا رہی ہیں، ہمیں خاصی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ ہم میں سے کم ہی لوگ ہوں گے جو اپنے کام کاج کو تج کر ایک مکمل نفیس سیاسی مقالہ مع تمام تر حواشی اور معلومات حاصل کرنے کی عیاشی کر سکتے ہوں۔ یا یوں کہیے کہ ہم لوگوں کو جہد للبقا نے اس قدر مصروف کر دیا گیا ہے کہ ہمارے پاس ان حالات کو سمجھنے کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ ان حالات میں حیران ہوں کہ آج کی رات اس لیکچر کے ذریعے آپ لوگوں کی خدمت میں کیا تحفہ پیش کروں؟ مزید یہ کہ ہمارے ذہنوں کو سیٹلائٹ ٹی وی کے ذریعے یکے بعد دیگرے اتنے بحرانوں میں دھکیلا جاتا ہے کہ ایک طرف وہ سوچنے کے قابل نہیں رہتے تو دوسری طرف بحران بھی اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ آج کی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بے رحم، غیر منصفانہ جنگوں، تباہ شدہ شہروں، جلتے کھیتوں، سکڑتے جنگلوں اور مرتے دریاؤں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ سب ہمارے لیے آثار قدیمہ بن گئے ہیں کہ ہماری تاریخ ان میں دفن ہو گئی ہے۔ ڈیزی کٹر بموں سے تباہ شدہ پہاڑ ہمارے لیے لائبریریاں بن گئے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے میں حیران ہوں کہ میں آج کیا پیش کر سکتی ہوں؟ ہاں میرے پاس دولت، جنگوں، ابھرتی ہوئی مطلق العنان شہنشاہیت، بے لگام نسل پرستی، اور موم کی طرح مڑ جانے والی بے بس و بے کس جمہوریت سے متعلق چند چبھتے ہوئے تکلیف دہ خیالات ہیں، پھر چند پریشانیاں، اور یہ سب مل کر پروانوں کے ایک گروہ کے مانند میرے ذہن کے گرد چھائے رہتے ہیں اور مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتے۔

میں تو بس انہیں ہی پیش کر سکتی ہوں۔

ممکن ہے آپ میں چند حضرات اسے میری بدتہذیبی قرار دیں کہ میں جسے جدید اقوام کی بڑی بڑی سرکاری کتابوں میں ہندوستانی شہری لکھ کر عزت عطا کی گئی ہے، وہ یہاں آ کر امریکی حکومت پر تنقید کرے۔ اپنے لیے میں بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ میں نہ تو کسی ملک کی علم بردار یا حاشیہ بردار ہوں نہ بلاوجہ حامی۔ اس کے برعکس میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ گرچہ لالچ بے رحمی اور مکر و فریب قریب قریب ہر ریاست کا خاصہ ہوتا ہے لیکن اس کا دائرہ بحرحال محدود ہوتا ہے۔ لیکن جب ایک ملک محض ایک ریاست نہ رہے بلکہ آمرانہ شہنشاہیت کا روپ دھار لے تو پھر اس کے ان اعمال کا دائرہ ڈرامائی طور پر وسیع ہو جاتا

ہے۔اس لیے میں واضح طور پر بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں آج امریکی شہنشاہیت کی ایک بے بس رعایا کے طور پر بولوں گی۔ میں ایسے غلام کی حیثیت سے بولوں گی جو اپنے بادشاہ پر تنقید کر رہا ہو۔

چونکہ یہ ایک رسم ہے کہ میرے لیکچر کا ایک عنوان ہو، تو میں اپنے اس لیکچر کا عنوان تجویز کرتی ہوں:

''مطلق العنان شہنشاہیت بمع جمہوریت ——ایک خریدیے، دوسری مفت''

اس آمریت یا مطلق العنان شہنشاہیت کی ابتداء اس وقت ہوئی جب روس کا بطور سپر پاور خاتمہ ہو گیا اور دنیا میں فقط ایک ہی سپر پاور رہ گئی۔ اس زمانے میں نئے عالمی نظام (New World Order) کا نعرہ سننے میں آیا۔ یہ نعرہ اتنا نامانوس تھا کہ اپنے معنی نہ سمجھا سکا۔ لیکن جلد ہی ایک واقعہ نے اس کے حقیقی معنی سمجھا دیے۔

۳ جولائی ۱۹۸۸ء کی بات ہے خلیج فارس میں متعین ایک میزائل بردار امریکی جہاز نے حادثاتی طور پر ایک ایرانی طیارہ مار گرایا جس میں سوار ۲۹۰ شہری مسافر ہلاک ہو گئے۔ ایسے اندوہناک حادثے پر معافی مانگنا اور معاوضہ ادا کرنا غلطی کے مرتکب ملک پر واجب ہوتا ہے۔ لیکن جارج بش اول جو ان دنوں اپنی صدارتی مہم میں بری طرح مصروف تھے، ان سے جب اس حادثہ پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے انتہائی سنگ دلی سے جواب دیا: ''ریاست ہائے متحدہ کی طرف سے میں کبھی بھی اس واقعہ پر معذرت نہیں کروں گا۔ حقائق چاہے کچھ بھی ہوں۔ مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں---''

''حقائق چاہے کچھ بھی ہوں۔ مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں---'' اس نئی امریکی شہنشاہیت کی صحیح معنوں میں بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس جواب میں ایک ذرا سی تبدیلی اسے شاید کچھ اور واضح کر دے۔

''حقائق صرف وہ ہو سکتے ہیں، جو ہم چاہیں--!''

جب ریاست ہائے متحدہ نے عراق پر حملہ کیا تو نیویارک ٹائمز اور سی بی ایس نیوز نے ایک سروے کیا اس سے پتہ چلا کہ ۴۲ فیصد امریکی عوام اس بات پر مکمل یقین رکھتے ہیں کہ صدام حسین نے گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون پر ہونے والے حملے کے براہ راست ذمہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ اے بی سی نیوز نے ایک سروے میں انکشاف کیا کہ ۵۵ فیصد عوام اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ صدام حسین نے القاعدہ والوں کی براہ راست مدد کی لیکن ان میں سے کوئی دعویٰ بھی ثبوت پر مبنی نہ تھا۔ کیونکہ ثبوت تو تھا ہی نہیں۔

دراصل یہ تمام تر امریکی ذرائع ابلاغ کا پھیلایا ہوا خود ساختہ، جھوٹا، بے بنیاد پروپیگنڈہ تھا۔ اس امریکی ذرائع ابلاغ، جسے ''آزاد پریس'' کے نام سے پکارا جاتا ہے، کا امریکی عوام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دراصل وہ کھوکھلا ستون ہے جس پر امریکی جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ عراق کے خلاف جنگ کے لیے عوام کی حمایت کی بنیاد جھوٹ، مکروفریب پر رکھی گئی جسے حکومت پر قابض ایک چھوٹے سے گروہ نے اپنے پروردہ اداروں کے توسط سے تقسیم کیا اور جسے ذرائع ابلاغ نے بہت ہی تابعداری اور فرماں برداری سے اچھالا۔

آپ جانتے ہیں کہ عراق اور القاعدہ کے درمیان من گھڑت رابطہ کے علاوہ جس چیز کا دیوانگی کی حد تک پروپیگنڈہ کیا گیا وہ عراق کے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار تھے جس سے دنیا بھر کو عام طور پر اور امریکہ کو خاص طور پر خطرہ تھا۔ جارج بش جونیئر تو اس حد تک چلے گئے کہ اپنے ایک بیان میں انہوں نے فرمایا کہ ''امریکہ نے عراق پر حملہ نہ کیا تو یہ خود اس کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا''۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز خیال تھا کہ ایک بھوکا، ننگا، تباہ شدہ اور برسوں سے محصور ملک کس طرح ایک عظیم الشان اور طاقت ور ترین ملک امریکہ کو تباہ کرسکتا ہے۔ (اس الزام کے تحت عراق شاید اس قطار میں آخری بلکہ تازہ ترین ملک ہے اس سے قبل اس میں کیوبا، نکاراگوا، لیبیا، گرینا ڈا اور پانامہ شامل ہیں)۔ لیکن یہ کوئی معمولی اور محض ہمسایوں سے دل لگی والی لشکرکشی نہ تھی بلکہ اس کے خاص مقصد اور عزائم تھے۔ یہ ایک پرانے فلسفے کو شراب کی نئی بوتل میں ڈالنا تھا۔ یہ ''حفظ ماتقدم کے طور پر حملے'' کا فلسفہ تھا اور اس کا مطلب دنیا پر صاف طور پر واضح کرنا تھا کہ امریکہ جو بھی اور جہاں بھی بدمعاشی کرنا چاہے کرسکتا ہے کیونکہ اس کا اسے حق حاصل ہے۔ اور یہ سب جائز اور سرکاری ہوگا۔

عراق کے خلاف جنگ لڑی اور چند ہی دنوں میں جیت بھی لی گئی لیکن جناب والا تباہ کن ہتھیار تو کہیں بھی دکھائی نہ دیے۔ یہاں تک کہ کوئی چھوٹا سا ہتھیار بھی نہ ملا جسے اشک شوئی کے طور دکھایا جاسکتا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ اس ہتھیار کو پہلے سے ہی کہیں رکھنا یا دبانا پڑتا اور پھر خود ہی برآمد کرنا پڑتا تو شاید یہ مسئلہ حل ہوتا۔ لیکن اگر ایسا کر بھی لیا جاتا تو پھر--- اس سے بھی بڑا ایک سوال ابھر کر سامنے آتا جس کا کسی سے جواب نہ بن پڑتا کہ --- اگر صدام کے پاس اس قسم کے ہتھیار تھے تو اس نے غیر ملکی حملہ آور فوج کے خلاف انہیں استعمال کیوں نہ کیا جبکہ وہ خود شکست بلکہ مکمل شکست کا سامنا کر رہا تھا۔

اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

بے شک ان کے پاس جواب نہیں لیکن ان میں ایسے احمق بھی ہیں جنہوں نے ٹی وی کی مضحکہ خیز رپورٹوں جن میں امریکی فوج کو چند بیرل کیمیائی محلول برآمد کرتے ہوئے دکھایا، کو دیکھ کر ان پر یقین کر لیا کہ صدام حسین کے پاس کیمیائی ہتھیار تھے۔ لیکن ابھی تک تو یہ بھی ثابت نہیں ہو سکا کہ ان میں کوئی ایسا کیمیائی محلول تھا جو ممنوعہ کہلاتا ہے اور جن برتنوں میں وہ ملے ـــــ وہ واقعی 'بیرنی' کہلائے جانے کے مستحق بھی ہیں یا نہیں ـــــ؟ (غیر معتبر خبروں کے مطابق ان میں چائے کے چمچ کے برابر پوٹاشیم پرمیگنیٹ (پانی صاف کرنے والی جراثیم کش سرخ رنگ کی دوا) بھی ملی تھی۔

بہر حال اس غیر قانونی عمل، بے جواز جنگ میں ایک شاندار پرانی تہذیب ایک نئی، وحشی اور سنگ دل قوم کے ہاتھوں تباہ ہو گئی۔ لیکن ایسے بھی لوگ پائے جاتے ہیں جن کا یہاں تک استدلال ہے کہ کیا ہوا اگر عراق کے پاس کیمیائی اور ایٹمی ہتھیار نہ تھے۔ کیا ہوا اگر عراق کے القاعدہ سے روابط نہ تھے۔ کیا ہوا اگر اسامہ بن لادن صدام حسین سے بھی اتنی ہی نفرت کرتا تھا جتنی امریکہ سے؟ بس اگر بش نے یہ کہہ دیا کہ صدام حسین ایک ''خونی ڈکٹیٹر'' ہے تو بس کافی ہے۔ یہ ایک ہی ثبوت اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ کہ ''عراق میں تبدیلی حکومت کی از حد ضرورت ہے''۔

یہ پہلا واقعہ نہیں۔ ایسا ایک دلچسپ واقعہ چالیس سال قبل بھی ہو چکا ہے جب صدر کینیڈی کے عہد میں سی آئی اے نے یہ راگ الاپا تھا کہ بغداد میں حکومت تبدیل ہونی چاہیے۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء میں ایک کامیاب بغاوت کے بعد بعث پارٹی نے بغداد میں حکومت پر قبضہ کیا۔ اس نئی حکومت کو سی آئی اے نے لوگوں کی فہرستیں فراہم کیں جس کی بنیاد پر اس نے ہزاروں ڈاکٹروں، انجینئروں، اساتذہ، وکلاء، سیاست دانوں اور ایسے افراد کا قتل عام کیا جو بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے اور نوجوان صدام کا اس قتل عام میں ہاتھ بتایا جاتا ہے (یہی ترکیب انڈونیشیا اور مشرقی تیمور میں استعمال کی گئی)۔ اس طرح دانش وروں کی ایک بڑی جماعت ذبح کر دی گئی۔ ۱۹۷۹ء میں بعث پارٹی میں آپس کے جھگڑوں کے نتیجے میں صدام حسین عراق کا صدر بن گیا۔ ۱۹۸۰ء میں جب وہ شیعوں کا قتل عام کر رہا تھا تو اس وقت کی نیشنل سیکورٹی کونسل کے مشیر برزنسکی نے کھلم کھلا اعلان کیا تھا:

''ہم امریکہ اور عراق کے بنیادی عزائم میں کوئی فرق نہیں محسوس کرتے''۔

چنانچہ واشنگٹن اور لندن کے حکمرانوں نے صدام کی دل کھول کر دامے، درمے اور سخنے مدد کی۔ سامان اور اسلحہ کے ساتھ ساتھ ایسا سامان بھی دیا جس سے وہ وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار بنا سکے۔ ایران سے آٹھ سالہ جنگ میں امریکہ اور برطانیہ نے تمام تر اسلحہ سپلائی کیا اور مالی مدد کی۔ پھر ۱۹۸۸ء میں جب کردوں نے بغاوت کی تو صدام نے امریکہ کی فراہم کردہ گیس سے ان کو بھون ڈالا۔ یہ وہ جرائم تھے جس میں صدام، امریکہ اور برطانیہ برابر کے شریک تھے۔ چودہ سال کے بعد انہیں دوبارہ یاد کیا گیا۔ امریکہ اور برطانیہ تو پاک صاف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ سارا قصور صدام حسین پر ڈال دیا گیا اور پھر انہیں عراق پر حملہ کی بنیاد اور جواز بنایا گیا۔ پہلی جنگ خلیج کے بعد انہی امریکی برطانوی اتحادیوں نے بصرہ میں شیعوں کو بھڑکا کے بغاوت کرائی اور جب صدام حسین نے اس بغاوت کو بے رحمی سے کچلتے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں لوگ ذبح کرائے تو یہ اتحادی کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر صدام حسین اتنا ہی برا شخص ہے جیسے اس کے جرائم کو دیکھتے ہوئے واضح اور صاف طور پر تاریخ کا سفاک ترین قاتل قرار دیا جائے (عراق پر لگائے گئے الزامات میں یہ سب سے پہلا الزام تھا) تو پھر ان لوگوں کو بھی تو مورد الزام ٹھہرا کر ان پر مقدمہ چلانا چاہیے جو صدام حسین کے جرائم میں برابر کے شریک تھے۔ بلکہ اسے تمام تر مالی، اخلاقی، سفارتی اور فوجی مدد دیتے رہے۔ امریکہ نے مطلوبہ اشخاص کے کارڈ جاری کیے تھے۔ انصاف کا تو تقاضا یہ ہے کہ ان پر امریکی اور برطانوی افسروں کی تصاویر بھی جاری کی جاتیں جو ان چیزوں کے ذمہ دار تھے۔ ان کی تصاویر اس لیے شائع نہ ہوئیں کہ

''جب معاملہ شہنشاہیت تک پہنچتا ہے تو حقائق کوئی معنی نہیں رکھتے!''

جی ہاں —— اب تو ہمیں یہی کہا جاتا ہے کہ یہ تو ماضی کی بھولی بسری باتیں تھیں۔ ان کا ذکر ہی کیا؟ اب تو صدام حسین ایک خون خوار درندہ بن چکا ہے جسے روکنا ضروری ہو گیا ہے اور صرف امریکہ ہی یہ نیک کام کر سکتا ہے۔ یہ ایک موثر طریقہ کار ہے کہ ماضی کے گھناؤنے جرائم جو چاہے آپ نے ہی کیے ہوں، کو نظر انداز کر کے اسے حال کے لیے اخلاقی طور پر عمل کے لیے استعمال کیا جائے اور پھر مستقبل کی جنگ یا لشکر کشی کے لیے جواز بنایا جائے۔ یہ عمل انڈونیشیا، پانامہ، نکاراگوا، افغانستان، عراق (فہرست طویل سے

طویل تر ہوتی جارہی ہے) پر آزمایا گیا اور خاصی کامیابی سے اس وقت بھی چند طاقتیں یا مملکتیں ایسی ہیں جن کو اس کام کے لیے پالا جارہا ہے۔ ان میں مصر، سعودی عرب، ترکی اور وسط ایشیا کی جمہوریتیں شامل ہیں۔

ابھی حال ہی میں ایک نئی اور دلچسپ چیز سامنے آئی ہے جس نے ہر چیز کا جواز ہی ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ امریکی اٹارنی جنرل ایش کرافٹ نے اپنے ایک حالیہ بیان میں فرمایا بلکہ وضاحت کی ہے کہ:

''امریکہ کو دنیا بھر میں دخل اندازی کی یہ آزادیاں کسی حکومت یا کسی معاہدہ کے تحت نہیں ملیں۔ بلکہ یہ تو خدا کی اپنی دین ہے۔!''

تو پھر جناب اقوام متحدہ کی کیا ضرورت ہے۔ جبکہ مدد کے لیے خود خدا حاضر ہے۔؟

تو اب یہ بات واضح ہوگئی کہ ہم دنیا بھر کے کمزور لوگ، ایک ایسی شہنشاہیت سے نبرد آزما ہیں جسے خدا نے بذات خود اس کام کے لیے مقرر کیا ہے اور پھر اس نیک کام کے لیے اسے تاریخ کی سب سے بڑی، سب سے طاقت ور اور بے مثال تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں سے مسلح ایک عظیم جنگی مشینری عطا فرمائی ہے اور جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہمیں تو اب پتہ چلا ہے کہ ہم ایک ایسی مطلق العنان شہنشاہیت سے نبرد آزما ہیں جس نے خود ہی اپنے آپ کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جب جی چاہے اور جس قوم و ملک کے خلاف چاہے جنگ چھیڑ دے۔ اسے یہ بھی اختیار ہے، چاہے خود عطا کردہ ہی، کہ کسی بھی ملک و قوم کے لوگوں کو پکڑ کر انہیں کرپٹ بنیاد پرست، عیاش، بدمعاش قرار دے کر صدیوں پرانے طریقے سے ان کا استحصال کر لے۔ اس مطلق العنان شہنشاہیت کا یہ عمل کامیابی سے جاری ہے اور جمہوریت اس کی نئی مکارانہ جنگی چال ہے۔

دنیا میں ہر جگہ جمہوریت کو یا تو بچانے یا پھر پہنچانے کا نعرہ لگایا جارہا ہے۔ یہ جمہوریت آپ کے دروازے پر ''ڈیزی کٹر'' نامی مہلک ترین بموں کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے، جو پہاڑ کو بھی ریزہ ریزہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور پھر موت تو ایک چھوٹی سی قیمت ہے جو شہنشاہیت کی اس نئی مصنوعات کو آزمانا یا استعمال کرنا چاہیں۔ اس طریقہ کار کو 'شہنشاہیت اور جمہوریت کا فوری ادغام'' کا نام دیجیے۔ کہ پہلے کوئی من گھڑت دل بھاتا الزام دھریے۔ پھر اسے دن رات دھراتے رہیے یہاں تک

کہ لوگوں کو از بر ہو جائے۔ پھر اس میں تھوڑا سا تیل ملائیں یعنی سنسنی کی ملاوٹ کریں۔ پھر یکدم بمباری شروع کر دیں۔ لیکن اگر یہ طریقہ روزمرہ کا چلن بن گیا تو پھر اس کے بعد---شاید—— کالے پیلے گندمی لوگ جیسے حبشی، جاپانی، افریقی، ایشیائی یہ سب ''انسان'' ہونے کے الزام سے بری ہو جائیں گے۔ یا پھر شاید ان لوگوں کی اموات بھی اموات کے زمرے میں نہ آئیں۔ ہماری تاریخ بھی تاریخ نہیں کہلائے گی۔ اس شہنشاہیت کی نظر میں سوائے گورے رنگ کے انسان کے دنیا میں کوئی بھی انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔ ہماری موت بھی انسان کی موت کہلانے کی حقدار نہیں ہوگی۔ ہماری تو تاریخ بھی تاریخ کہلانے کے لائق نہیں بلکہ شاید کبھی تھی بھی نہیں——!

آیئے تاریخ کی بات کرتے ہیں۔ ان ہی پچھلے چند ماہ کے دوران جبکہ پوری دنیا دیکھ رہی تھی، امریکی حملے، اور افغانستان اور عراق پر قبضے سب ہی ٹیلی وژن پر براہ راست دکھائے گئے۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اسامہ بن لادن مع افغانستان کی طالبان حکومت اور عراق میں صدام حسین کی حکومت جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئیں اور دنیا کے نقشے ہی غائب ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ان علاقوں میں یکدم وہ دور آ گیا جسے تبصرہ نگار ''طاقت کا خلا'' کہتے ہیں۔ وہ شہر جو مدت سے محاصرے میں تھے، جن میں مدتوں سے غذائی اجناس پانی، بجلی نہیں تھی وہ مجبور اور بے بس شہر بے رحمانہ بمباری سے کھرچ ڈالے گئے۔ اور ان کے باسی جو گزشتہ دس سالوں سے اقوام متحدہ کی پابندیوں کے تحت مسلسل فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہے تھے یکدم ایک بیرونی اجنبی طاقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے گئے۔ ایک سات ہزار سالہ پرانی شاندار تہذیب یکدم لاقانونیت کے اندھیرے میں دھکیل دی گئی۔ میں نے، آپ نے، بلکہ سب نے براہ راست ٹی وی پر دیکھا کہ غنڈے اور بدمعاش، دکانیں، ہسپتال اور دفاتر کو توڑ توڑ کر اور ان میں گھس گھس کر سامان لوٹ کے لے گئے۔ فاتح امریکی اور برطانوی فوجی ان کے پاس ہی کھڑے یہ دلچسپ تماشے دیکھتے رہے۔ ان کا کہنا تھا ہمیں دخل دینے کا حکم نہیں ہے۔! ہاں انہیں تو بس لوگوں کو قتل کرنے کے احکامات ملے تھے، بچانے کے نہیں۔ ان فوجیوں کی ترجیحات واضح تھیں۔ عراقی عوام کی حفاظت ان کی ذمہ داری تھی۔ اس عظیم تباہی کے بعد عراق میں جو چھوٹی چھوٹی چیزیں بچ گئی تھیں، ان کی حفاظت ان کی ذمہ داری نہ تھی۔ ہاں عراقی تیل کے چشموں کی کڑی حفاظت ان کی اولین بلکہ سب سے بڑی ذمہ داری تھی۔ بے شک یہ ان

کی بھاری ذمہ داری تھی۔ اور اتنی بھاری کہ تیل کے یہ چشمے تو حملے سے پہلے ہی قطعی محفوظ کر لیے گئے تھے۔

سی این این اور بی بی سی پر لوٹ مار کے مناظر براہ راست دکھائے گئے اور بار بار دکھائے گئے۔ ٹی وی کے فاضل تبصرہ نگار، فوجی اور سرکاری ترجمان اس لوٹ مار کو آزاد ہونے والے عوام کا ایک غاصب حکومت کے خلاف نفرت اور غم وغصہ قرار دیتے تھے۔ امریکی سیکرٹری دفاع کا ارشاد تھا:

''یہ جو کچھ ہو رہا ہے، آزادی کی پیداوار غلاظت ہے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ جبر سے آزاد ہونے والے لوگ اب آزاد ہیں کہ وہ جو جرائم کرنا چاہیں کریں، غلطیاں کریں اور قابل اعتراض حرکتیں کریں۔ یہ ان کا حق ہے اس لیے کہ وہ طویل جبر کے دباؤ سے اب آزاد ہوئے ہیں۔''

کیا آپ کو علم ہے کہ درج بالا ارشاد فرمانے والے ڈونلڈ رمزفیلڈ بذات خود ایک انارکسٹ یعنی لاقانونیت پسند شخص ہیں۔ میں حیران ہوں کہ کیا اس مدبر کی یہی رائے لاس اینجلس میں ہونے والے ہنگاموں کے لیے بھی ہے جو روڈنی کنگ کو زدوکوب کرنے پر ہوئے تھے۔ کیا اس کا یہ عظیم فلسفہ ''آزادی کی پیداوار غلاظتیں'' ان بیس لاکھ قیدیوں پر بھی منطبق ہوتا ہے جو اس وقت بھی امریکی جیلوں میں بند ہیں۔ (جی ہاں دنیا کے سب سے بڑی آزادی پسند ملک میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ تعداد میں قیدی جیلوں میں بند ہیں)۔ کیا وہ ان افریقی امریکی کالے نوجوانوں کا ذکر پسند کریں گے جن کی ۲۸ فیصد تعداد اپنی بالغ زندگی کا کچھ نہ کچھ حصہ جیل میں گزارنے پر مجبور ہوتی ہے)۔ کیا وہ وضاحت کرنا پسند کریں گے کہ وہ ایک ایسے صدر کے تحت کیوں کام کر رہے ہیں جس نے اپنی ٹیکساس کی گورنری کے زمانے میں ۱۵۲ لوگوں کو سزائے موت دی تھی۔

عراق کی جنگ شروع ہونے سے قبل امریکی ادارے ''دفتر برائے تعمیر وترقی اور انسانی امداد'' (ORHA- Office of Reconstruction and Humanitarian Assistance) نے پنٹاگون کو ایسے عراقی اداروں کی فہرست فراہم کی تھی جن کی حفاظت کو لازمی قرار دیا گیا تھا۔ ان میں بغداد میں موجود عجائب گھر (نیشنل میوزیم) اہمیت کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر تھا۔ یہ عراق کی پرانی شاندار تہذیب کا وارث تھا۔ لیکن امریکی فوجیوں کی عین موجودگی بلکہ ان کی سرپرستی میں اسے بے دردی سے لوٹ لیا گیا بلکہ یوں کہا جانا چاہیے کہ اسے لوٹ لیے جانے کی دعوت دی گئی۔

عراق، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، میسوپوٹومیا کی دریائی وادی کا حصہ ہے۔ یہاں دجلہ وفرات کے درمیان جس عظیم تہذیب نے حصہ لیا اس نے دنیا کو پہلی دفعہ لکھنا پڑھنا سکھایا۔ پہلا کیلنڈر دیا، پہلی باقاعدہ لائبریری اور پہلا ہی باقاعدہ شہر دیا۔ اور وہاں سب سے پہلے بلکہ دنیا کی سب سے پہلی جمہوریت نے جنم لیا۔ بابل کا شاہ حمورابی پہلا شخص تھا جس نے شہریوں کو سماجی زندگی گزارنے کے لیے پہلی مرتبہ قوانین کا مجموعہ مرتب کیا۔ یہ وہ قوانین تھے جن میں مظلوم خواتین، طوائفوں، غلاموں، یہاں تک کہ جانوروں کے حقوق بھی متعین کیے گئے اور پھر ان کا تحفظ بھی کیا گیا۔ حمورابی کے مجموعہ قوانین کو نہ صرف قوانین کی ماں تسلیم کیا گیا بلکہ اس سے سماجی انصاف کا تصور بھی پیدا ہوا۔ امریکی حکومت اس سے زیادہ مناسب وموزوں سرزمین کا انتخاب کر ہی نہیں سکتی تھی جہاں وہ اپنی غیر قانونی اور انصاف کی دھجیاں اڑانے والی جنگ لڑ سکے۔

جن دنوں عراق میں لوٹ مار جاری تھی، سیکرٹری رمز فیلڈ، جسے شیطانی نمائندہ (Prince of Darkness) کہنا زیادہ موزوں ہوگا، نے اپنے میڈیا کے چمچوں کو بتایا:

''آپ جو تصاویر ٹیلی وژن پر بار بار دیکھ رہے ہیں، یہ دراصل ایک ہی تصویر ہے جسے بار بار دکھایا جا رہا ہے۔ یہ ایک ہی شخص کی تصویر ہے جو بغداد کے میوریم سے ایک نقشین برتن لے کر بھاگ رہا ہے۔ اس تصویر کی بیس دفعہ دیکھ کر آپ بھی شک میں پڑ سکتے ہیں کہ ''میرے خدا کیا بغداد میں اتنے ڈھیر سارے نقشین برتن موجود ہیں؟ اتنے تو پورے عراق میں بھی نہیں ہو سکتے۔ اتنے برتن ان لوگوں کے پاس کہاں سے آئے ــــ؟''

اس پر پریس روم میں ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

اب آپ ہی بتائیے کیا یہ انصاف پر مبنی ہوگا کہ بارلم کے غریبوں کو نیویارک کا عظیم میٹروپولیٹن میوزیم لوٹنے کی اجازت دی جائے؟ کیا اس لوٹ مار کی بھی اسی خوش دلی سے قبول کر لیا جائے گا؟

ORHA کی فراہم کردہ فہرست میں سب سے آخری نام وزارت تیل کا تھا جسے بچانا لازمی قرار دیا گیا تھا۔ بس ایک یہی عمارت تھی جسے تحفظ دیا گیا۔ شاید قابض فوجوں نے یہ سمجھا کہ مسلمان ممالک میں فہرست نیچے سے اوپر کی طرف پڑھی جاتی ہے اور سب سے اہم چیز سب سے آخر میں لکھی جاتی ہے۔

ہمارا ٹیلی وژن ہمیں مسلسل بتا رہا ہے کہ عراق کو آزاد کرا لیا گیا اور افغانستان کو عورت کے لیے جنت بنانے کا عمل جاری ہے۔ اور یہ تمام تر بش اور بلیئر کی مہربانی اور کارنامہ ہے جو اکیسویں صدی میں عورتوں کے سب سے بڑی حمایتی ہیں۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ عراق کا نظم و نسق ہی تباہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے عوام کو فاقہ کشی تک پہنچا دیا گیا ہے۔ اس کے غذائی دفاتر ختم ہو چکے ہیں۔ مزید یہ کہ عراق کو سنی اور شیعہ عوامی خانہ جنگی میں دھکیلا جا رہا ہے۔ جبکہ افغانستان طالبان کے عہد سے قبل کے لاقانونیت کے دور میں جا پڑا ہے اور اس کی سرزمین جنگجو سرداروں نے زبردستی قبضہ کر کے آپس میں بانٹ لی ہے۔

یہ سب کچھ جمہوریت کے نام پر کیا گیا ہے۔ اس جمہوریت کے نام پر جو ہماری اس آزاد دنیا کی ایک بے بس طوائف کی طرح ہے جو ہر وقت کپڑے اتارنے اور پہننے پر مجبور ہے۔ اس بے چاری کو ہر قسم کے ذوق پر پورا اترنا پڑتا ہے۔ جو ہمیشہ ہر موقع پر استعمال اور رد ہونے کے لیے تیار رہتی ہے۔ جمہوریت سے بڑھ کر فائدہ مند مذاق کوئی نہیں۔ خود ہی دیکھ لیجیے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت —— بھارت۔ سب سے دلچسپ جمہوریہ جنوبی افریقہ۔ سب سے زیادہ طاقت ور اور مطلق العنان جمہوریہ —— امریکہ —— اور سب سے بے بس اور مجبور عراق جہاں جمہوریت کو دھکیل کر پہنچانے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ جمہوریت کا کیا تصور پیش کرتے ہیں؟

۱۹۸۰ء تک تو بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ جمہوریت لوگوں میں حقیقی سماجی انصاف پہنچانے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئی ہے۔ لیکن جدید جمہوریتیں اب ہمارے درمیان اتنے عرصہ سے ہیں کہ نئے آزاد سرمایہ داروں نے اسے توڑ مروڑ کر اپنے حق میں لانا سیکھ لیا ہے۔ انہوں نے اس امر میں مہارت حاصل کر لی ہے کہ جمہوریت میں کس طرح نقب لگائی جائے نیز خود مختار عدلیہ، آزاد پریس اور پارلیمنٹ کو کس طرح اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ دنیا پر چھا جانے کی خواہش نے ہر قانون کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ آزاد انتخابات، آزاد پریس اور خود مختار عدلیہ اس وقت بے وقعت اور بے معنی ہو جاتے ہیں جب انہیں کھلے بازار میں ایسی بکنے والی جنس بنا دیا جاتا ہے جو زیادہ دام لگانے والے کے ہاتھوں آسانی سے بک جائے۔ اس امر کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے کہ جمہوریت مفادات کے کس قدر نرغے میں ہے، ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ ہمارے اردگرد جو معاصر جمہوریتیں بلکہ جمہوری ممالک ہیں، ان میں کیا ہو رہا ہے؟ دنیا

کی سب سے بڑی جمہوریہ بھارت (جس کے متعلق میں اتنا کچھ کہہ اور لکھ چکی ہوں کہ اسے دہرانا بے سود ہوگا)۔ دنیا کی دلچسپ ترین جمہوریہ، جنوبی افریقہ کے متعلق سنیے۔

جنوبی افریقہ میں نسلی برتری کے زعم میں کالی اکثریت پر گوری اقلیت کے تین سو سالہ، ناجائز، بے رحمانہ اور بہیمانہ قبضہ کے بعد ۱۹۹۶ء میں ایک غیر نسلی اور کثیر الجماعتی جمہوریت برسر اقتدار آئی اور نیلسن منڈیلا نامی ایک سیاہ فام شخص کو سربراہ مملکت بنایا گیا۔ یہ ایک عجیب اور واقعاتی کامیابی تھی۔ اپنے اقتدار میں آنے کے دو سال کے اندر اندر حکمران افریقی نیشنل کانگریس دنیا کے تجارتی خداؤں کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ پھر اس نے معاشی ہمواری، پرائیویٹائزیشن اور معیشت کو آزاد کرنے کے لیے جتنے بھی بھرپور اور بڑے بڑے منصوبے شروع کیے ان کا نتیجہ اس کے علاوہ کچھ نہ نکلا کہ امیروں اور غریبوں میں فرق بڑھ گیا۔ دس لاکھ سے زائد کالے اپنے روزگار سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جوں ہی بنیادی ضرورتوں یعنی بجلی، پانی اور گھروں کی تعمیر کی کارپوریشن بنی تو اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کروڑ جنوبی افریقی جو کل آبادی کا کم و بیش چوتھائی ہیں بجلی پانی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لگ بھگ بیس لاکھ افراد اپنے اپنے گھروں سے نکال دیے گئے۔

اس دوران وہ چھوٹی سی گوری اقلیت جسے تاریخی طور پر صدیوں سے ظالمانہ استحصال کے ذریعے شاندار بلکہ شاہانہ مراعات حاصل تھیں وہ پہلے سے بھی زیادہ محفوظ رہی۔ یہ اقلیت اب تک بدستور ملک کی زمینوں، کھیتوں، فیکٹریوں اور روزگار کے ان گنت وسائل پر قابض ہے۔ ان کے لے نسلی امتیاز اور نئی غیر امتیازی پالیسی میں کوئی فرق نہیں۔ نسلی امتیاز پر ان کا ضمیر مطمئن اور صاف تھا اور وہ اس پر عمل پیرا رہے اور یہ سب کچھ جمہوریت کے نام پر ہوتا رہا۔ ان نئے حکمرانوں کے لیے جمہوریت صرف یہ تبدیلی لائی کہ وہ اب بھی کسی شہنشاہ کی طرف سے بولتے ہیں لیکن تلخ حقائق کو نرم الفاظ میں چھپا کر۔ خود پہلی دنیا کے ترقی یافتہ اور متمدن ممالک میں جمہوریت کی مشین بری طرح فیل ہو چکی ہے۔ سیاست دانوں، صحافت کے ناخداؤں، ججوں، ملک کی طاقت ور لابیوں اور سرکاری اہلکاروں نے آپس میں مل کر بلکہ گٹھ جوڑ کر کے اندرونی طور پر ایسا چکر دار بلکہ چکرا دینے والا نظام تخلیق کر رکھا ہے جس نے آئین، عدلیہ، پارلیمنٹ اور انتظامیہ کے درمیان توازن رکھنے کے نظام کو معطل کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کا سب سے اہم نشانہ آزادانہ

صحافت بنی جو پارلیمانی جمہوریت کو بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اس چکرا دینے والے نظام کی تخلیق نہ تو کسی کی چالاکی کا نتیجہ ہے اور نہ ہی محنت کا، بلکہ بڑے لوگوں کی ضروریات کا نتیجہ ہے۔

اس کی ایک عمدہ مثال اٹلی کے وزیراعظم سلویو بیرلسکونی (Silvio Berlusconi) ملک کے بڑے بڑے اخبارات، رسالوں، ٹیلی ویژن چینلوں اور اشاعتی اداروں کے مالک ہیں۔ فنانشل ٹائمز نے حال ہی میں ایک رپورٹ میں بتایا کہ وزیراعظم موصوف اٹلی کے نوے فیصد ٹیلی وژن دیکھنے والوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ حال ہی میں رشوت ستانی کے ایک مقدمے کا سامنا کرتے ہوئے انہوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ پورے اٹلی میں صرف وہی ایک فرد ہیں جو اٹلی کو بائیں بازو کے اثرات سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ انہوں نے کہا--''میں کب تک اپنے ملک کے لیے ان گنت قربانیاں دیتا رہوں گا''۔ ان کے اس بیان سے صرف وہی دس فیصد متاثر نہ ہو سکے جو ٹی وی نہیں دیکھتے۔ کیا بولنے کی آزادی کی یہی قیمت ہے۔ اور پھر آزادی ہے کس کے لیے؟

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں معاملہ اس سے بھی زیادہ گنجلک ہے۔ کلیر چینل ورلڈ وائیڈ انکارپوریٹڈ (Clear Channel Wordlwide Incorporated) نامی ادارہ ملک بھر کے سب سے زیادہ ریڈیو اسٹیشنوں کا مالک ہے۔ اس کے بارہ سو ریڈیو اسٹیشن ہیں جو ملک بھر کا نو فیصد ہیں۔ اس کے چیف ایگزیکٹو نے بش کی الیکشن مہم میں لاکھوں ڈالر کے عطیات دیے تھے۔ جب عراق کی جنگ کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے لاکھوں امریکی سڑکوں پر نکل آئے تو اس کلیر چینل نے پورے ملک میں جنگ سے کہیں پہلے بلکہ بہت پرانے حب الوطنی پر مبنی عوامی مظاہرے دکھانے شروع کر دیے اور اپنے ریڈیو اسٹیشنوں کو ان کے اشتہارات کے لیے استعمال کیا۔ اس سے عوام کو گمراہ کرنے میں خاصی آسانی رہی۔ ساتھ ہی اپنے نامہ نگاروں کو بھی بھیجا کہ وہ ان محب وطن مظاہروں کو بریکنگ نیوز کے طور پر استعمال کریں۔ گویا لوگوں کی رائے عامہ بنانے کی بجائے خبریں گھڑنے کا زمانہ آ گیا۔ جلد ہی ذرائع ابلاغ خبریں پیش کرنے کے لیے اخبار نویسوں کی خدمات ترک کر کے ڈراموں کے پروڈیوسروں کی خدمات حاصل کیا کریں گے۔

جوں جوں امریکہ کا شو بزنس زیادہ سے زیادہ تند و تیز اور جنگی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے اس طرح

امریکی جنگیں بھی زیادہ سے زیادہ شوبزنس بنتی جارہی ہیں۔ان دونوں نے آپس میں کچھ دلچسپ چیزوں کا لین دین کیا ہے۔دیکھ لیجیے۔جس سٹیج ڈیزائنر نے دوحہ،قطر میں ڈھائی ڈھائی لاکھ ڈالر مالیت کا وہ سٹیج تیار کیا تھا جس پر کھڑے ہوکر امریکی جنرل ٹومی فرینک نے اپنے جنگی منصوبے کا اعلان کیا تھا۔وہی مشہور امریکی فلمی اسٹوڈیوز یعنی ڈزنی لینڈ ایم جی ایم اور ''صبح بخیر'' امریکہ کے سیٹ تیار کرتا ہے۔

کیا یہ ایک ظالمانہ مذاق نہیں کہ امریکہ جس کے پاس آزادی اظہار کے تیز وطراز، پرجوش آواز رکھنے والے محافظ ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی حفاظت کے لیے سخت قوانین بھی۔اس نے تمام در بند کر کے فقط ایک مختصر سی درز چھوڑی ہے جہاں سے اس آزادی کی فقط تعریف ہی کی جاسکتی ہے۔خود آزادی اظہار کی کوئی گنجائش نہیں۔دراصل آزادی اظہار کا طریقہ اتنی پیچیدہ اور چکردار ہے کہ امریکہ میں اس کے حق میں جو بھی آواز بلند کی جاتی ہے وہ قانون اور بنیادی تصور کے مطابق ضرور ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ اس آزادی کو استعمال کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہوتی ہے۔پورے ملک میں خبروں اور تفریح کے تمام ذرائع پر چند ہی کمپنیوں یا کارپوریشنوں کا قبضہ ہے اور یہ اندر سے سب ایک ہیں۔ان میں بڑی بڑی کمپنیاں AOL، ٹائم وارنر، وایاکام، نیوز کارپوریشن ہیں۔ان میں سے ہر کمپنی متعدد ٹیلی وژن سٹیشنوں، فلم اسٹوڈیوز، ریکارڈنگ کمپنیوں اور بڑی بڑی پبلشنگ کمپنیوں کی مالک ہے۔نتیجہ میں سارے دروازے کامیابی سے بند ہیں۔

پھر ـــــ امریکہ کی اس پھیلی ہوئی ابلاغ کی شہنشاہیت کو بظاہر بے غرض لوگوں کی ایک انتہائی مختصر سی جماعت کنٹرول کرتی ہے۔فیڈرل کمیونیکیشن کمیشن کا چیئرمین مائکل پاول ہے جو امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کا ہونہار سپوت ہے۔اس نے حال ہی میں اس صفت سے وابستہ مزید کچھ سرکاری کارپوریشنوں کو آزادی دینے کا مطالبہ کیا ہے جو اس کے کمیشن میں شامل ہوکر اسے مزید وسعت دے سکیں۔

تو یہ ہے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ جس کو ایسا شخص چلا رہا ہے جو الیکشن میں قانونی طور پر کامیاب نہیں ہوا تھا بلکہ اسے یہ عہدہ سپریم کورٹ نے تحفے میں دیا تھا اور امریکی عوام کو اس کی کتنی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔

اس بش جونیئر کے تین سالہ دور صدارت میں امریکی معیشت کو بیس لاکھ روزگار کے مواقع سے ہاتھ دھونا پڑے ہیں۔ بیرونی فوجی اخراجات، تجارتی فلاح و بہبود، امیروں کو ٹیکسوں کی چھوٹ نے امریکی تعلیمی نظام کے لیے ایک عظیم مالی بحران پیدا کر دیا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ بش نے عراقی جنگ لڑنے کے لیے امریکی کانگریس سے کل ۸۰ ارب ڈالر کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ رقم کہاں سے پوری کی گئی۔ سنیے۔ نیشنل کونسل آف اسٹیٹ لیجسلیچر (National Council of State Legislature) کے ایک سروے کے مطابق امریکی حکومت نے ۲۰۰۲ء میں عوامی خدمات، صحت فلاح و بہبود کے پروگراموں اور تعلیم کے بجٹ میں ۴۹ ارب کی کٹوتی کی۔ اس سال ان کا ارادہ اپنی مدوں میں ۷ء۲۵ ارب ڈالر کی کٹوتی کا ہے۔ اس طرح کل رقم ۷۵ ارب ڈالر ہوگئی۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس زبردستی کی جنگ کے اخراجات کون پورے کر رہا ہے۔ یہ جنگ امریکہ کے غریب، اس کے طلباء، اس کے بے روزگار عوام، اس کی بیوائیں، اس کے ہسپتال، اس کے مریض، اس کے اساتذہ اور طبی رضا کار سب مل جل کر ادا کر رہے ہیں۔

اب اس پر غور کیجیے کہ اس جنگ کو لڑ کون رہا ہے اور اپنی جانیں کون قربان کر رہا ہے؟ پھر وہی غریب اور نادار امریکی۔ وہ سپاہی جو عراقی صحرا میں جھلس رہے ہیں اور بے وجہ بے موت مارے جا رہے ہیں وہ کوئی امراء کے بچے نہیں ہیں۔ آپ کو سن کے تعجب ہوگا کہ امریکی کانگریس اور سینٹ کے سینکڑوں نمائندگان میں سے صرف ایک کا بچہ عراق گیا ہوا ہے۔ امریکہ کی رضا کار فوج دراصل حاجت مندوں اور غربت کے مارے ہوئے امریکیوں کی فوج ہے۔ یہ غریب سفید فام سیاہ فام لاطینی لوگوں اور ایشائیوں پر مشتمل ہے جو محض چند سکے کمانے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے فوج میں شامل ہو جاتے ہیں۔

دفاعی اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مسلح افواج کا اکیس فیصد اور بری افواج کا انتیس فیصد افریقی امریکنوں یعنی کالوں پر مشتمل ہے اور یہ سب ملا کر کل آبادی کا بارہ فیصد بنتے ہیں۔ یہ ایک دلچسپ مذاق ہی تو ہے کہ افریقی امریکنوں کی تعداد کا ایک بڑا حصہ فوج اور جیل میں ہے۔ اس کا ایک دلچسپ اور مثبت--- جی ہاں مثبت پہلو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ قریب قریب چالیس لاکھ امریکی (ملک کی آبادی کا دو فیصد) اپنی مجرمانہ سرگرمیوں/ حرکات کی وجہ سے ووٹ دینے کا حق کھو بیٹھتے ہیں۔ اس میں سے چودہ لاکھ افریقی

امریکن یعنی کالے ہیں۔ فوجیوں اور قیدیوں کو ویسے ہی ووٹ دینے کا حق نہیں۔ اس طرح ووٹ دینے کے اہل کالوں کی تیرہ فیصد ووٹ دینے سے محروم کردی گئی۔ اسے کہتے ہیں صحیح معنوں میں جمہوریت ـــــ!

۲۰۰۴ء میں امریکہ میں صدارتی الیکشن منعقد ہوگا۔ ۲ مئی کو صدر بش نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز اس امید پر کیا کہ وہ دوبارہ منتخب ہو جائیں گے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک مختصر سا ناٹک رچایا۔ چنانچہ تاریخ کی سب سے مختصر پرواز، جو غالباً چند ہزار گز پر مشتمل ہوگی، سے وہ ایک فوجی جیٹ طیارہ میں سامنے ہی سمندر میں کھڑے ہوئے ہوائی جہاز بردار جہاز ''ابراہم لنکن'' پر اترے۔ یہ جہاز ساحل سے اتنا قریب تھا کہ ایسوسی ایٹڈ پریس کے مطابق اس امر کی تعریف کی گئی کہ صدر بش کی تقریر کے لیے جہاز کا اس سے بہتر منظر ممکن نہ تھا کہ کیمرہ میں پورا جہاز بھی سما جائے اور پس منظر میں سمندر بھی لہریں لیتا دکھائی دے۔ بجائے اس کے کہ جہاز اپنے اصلی مستقر کے ساحل پر دکھایا جائے۔

پھر ـــــ صدر بش نے زندگی کا ایک دن بھی فوج میں نہیں گزارا لیکن ہوائی جہاز کے کاک پٹ سے وہ پورے فوجی فینسی ڈریس میں برآمد ہوئے۔ انہوں نے بمبار ہوا باز کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے علاوہ جنگی بوٹ، دوران پرواز استعمال ہونے والا چشمہ، سر پر فوجی ہلمٹ، سب ہی کچھ پہن رکھا تھا۔ استقبال کے لیے موجود پرجوش فوجیوں کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے انہوں نے بڑے پرمسرت لہجے میں عراق پر اپنی شاندار فتح کا سرکاری اعلان کیا۔ ہاں البتہ یہ احتیاط ضرور برتی کہ اعلان میں فقط اتنا ہی کہا کہ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ میں یہ صرف ایک فتح ہے۔ جنگ ابھی جاری ہے ـــــ''

یہ ضروری اور اہم تھا کہ اپنی سیدھی سادی مکمل فتح کا اعلان نہ کیا جائے کیونکہ جنیوا کنونشن کے مطابق قابض فوج کو مفتوحہ علاقے کی تمام تر ذمہ داریاں سنبھالنی پڑتی ہیں، جن میں امن وامان کی مکمل ذمہ داری بھی شامل ہے جو امریکی انتظامیہ اپنے سر پر لینا نہیں چاہتی تھی۔

پھر ۲۰۰۴ء کے انتخابات بھی قریب آ رہے ہیں اس لیے امریکی عوام کو خوش کرنے اور ان کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے بش کو ''دہشت گردی کے خلاف ایک اور فتح'' کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ شام کو اس قتل کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔

عوام کو بہکانا بھی تو آسان ہے۔ جرمنی کے پرانے نازی لیڈر ہرمن گوئرنگ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ

''عوام ہمیشہ لیڈروں کے بہکاوے میں آجاتے ہیں۔ آپ کو صرف اتنا کرنا پڑتا ہے کہ ان سے کہیں کہ ان پر حملہ ہونے والا ہے اور یہ کہ ان میں حب الوطنی کی کمی ہے جس کی وجہ سے ملک اور قوم کی سلامتی کو خطرہ ہے''۔ بس اتنا کہنا ہی کافی ہوتا ہے اور قوم اور عوام لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ طریقہ ہر ملک اور قوم میں مفید ثابت ہوتا ہے۔—'' وہ سچ کہتا تھا کہ یہ سب سے آسان بات ہے اور ہماری بش انتظامیہ نے بھی یہی طریقہ اپنایا ہے۔ الیکشن کی مہم اور جنگ، جمہوریت اور آمریت کے درمیان فاصلہ اب تیزی سے کم ہو رہا ہے۔

ان جنگی مہموں میں ایک چیز کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اس میں امریکی جانیں ضائع نہ ہوں۔ یہ سبق بڑی شدت سے ویت نام میں سیکھا گیا تھا۔ اس سے امریکی ووٹروں کے اعتماد پر برا اثر پڑتا ہے لیکن ان جنگوں میں امریکی سپاہیوں کی ہلاکت کے مسئلے پر بھی کم وبیش قابو پالیا گیا ہے کہ دو بدو جنگ کی نوبت ہی نہیں آنے دی جاتی، دور ہی سے میزائل برسائے جاتے ہیں۔ پھر شدید قسم کی بمباری کی جاتی ہے اور جب میدان صاف ہو جاتا ہے تو ٹینکوں کی مدد سے قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ عراق پر اس طرح کے حملے کو ''آپریشن شاک اینڈ آء'' (Operation Shock and Awe) یعنی ''ضرب اور حیرت'' کا جب نام دیا گیا تو جنرل ٹامی فرینک نے اعلان کیا: یہ جنگ ایسی ہوگی جیسی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی۔—'' ممکن ہے وہ صحیح کہہ رہے ہوں۔ میں فوجی تاریخ کی ماہر تو نہیں لیکن تاریخ میں اس طرح کی جنگ لڑی کب گئی تھی۔ ذرا یہ تو بتائیں۔

خود دیکھیں— اقوام متحدہ کی تمام تر چالبازیوں اور چالاکیوں، جن میں معاشی پابندیاں اور ہتھیاروں کے معائنے سب ہی کچھ شامل ہیں، کے مکمل ہونے کے بعد اور یہ یقین کر لینے کے بعد کہ عراق کو بے دست و پا کر گھٹنوں پر جھکا دیا گیا ہے اور یہ کہ اس کے باشندے فاقہ کشی کی نوبت تک پہنچ چکے ہیں، پانچ لاکھ سے زائد بچے ہلاک ہو چکے ہیں، اس کا انتظامی ڈھانچہ بری طرح تباہ ہو چکا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی یقین کر لینے کے بعد کہ اس کے زیادہ تر ہتھیار تباہ و برباد ہو چکے ہیں اور وہ قریباً نہتا ہو چکا ہے— تو ایک ایسی انتہائی بزدلی کے ساتھ جس کی مثال تاریخ میں یقیناً نہیں ملے گی، ان ہم خیالوں کے اتحاد (جسے دھمکائے اور خریدے ہوئے لوگوں کا اتحاد کہنا چاہیے) نے اپنی حملہ آور فوج عراق بھیج دی۔ یہ تھی عراق کی

آزادی کی مہم۔ یہ تو بس ایسی ہی مہم ہے جیسے کہا جائے ''آؤ ہم دونوں ایک دوڑ لگائیں اور دیکھیں کون جیتتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ میں پہلے تمہارے گھٹنے توڑ لوں''۔

جوں ہی یہ جنگ شروع ہوئی فرانس، جرمنی اور روس کی حکومتیں جنہوں نے اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل میں اس جنگ کو قانونی قرار دینے اور اس کی حمایت کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا، بلکہ سختی سے رد کر دیا تھا وہی اس قسم کے بیان دینے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرنے لگیں کہ ان کی دلی خواہش ہے کہ امریکہ یہ جنگ جلد از جلد جیت جائے۔ پھر، جرمنی میں اس مقدس کام کے لیے ہوائی اڈے کھول دیے گئے۔ جرمن وزیر خارجہ فشر نے عوام میں آ کر بیان دیا کہ ان کی دلی خواہش ہے کہ صدام حکومت جلد سے جلد منہدم ہو جائے۔ روسی صدر پیوٹن نے بھی ایسی ہی تمنا کا عوام میں اظہار کیا۔ یہی وہ حکومتیں تھیں جو عراق کو غیر مسلح کرنے کی سازش میں باقاعدہ شریک تھیں اور بعد میں حملہ آوروں کے ساتھ باقاعدہ شریک ہو گئیں۔ انہوں نے نہ صرف عراق کے حصے بخروں میں سے اپنا حصہ ملنے کی امید ظاہر کی بلکہ یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ جنگ سے قبل عراق سے ان ممالک کے جو معاہدے ہو چکے ہیں ان کا احترام بھی کیا جائے گا۔ کوئی بہت ہی بھولا بھالا بلکہ عقل کا اندھا ہی ان پرانے شاطروں سے ایسا نہ کرنے کی توقع رکھ سکتا ہے۔ جنگ کے دنوں میں اقوام متحدہ میں جو بلند و بانگ دعوے اور سستی سنسنی خیز تقاریر ہوئیں ان سے قطع نظر جب کوئی خطرناک وقت آیا تو ان مغربی اقوام کا اتحاد قابل دید تھا۔ حالانکہ خود ان کے اپنے عوام کی اکثریت جنگ کے خلاف بری طرح مظاہرے کر رہی تھی۔

جب ترکی کی حکومت عارضی طور پر اپنے نوے فیصد عوام کی خواہشات کے سامنے جھک گئی اور اس نے امریکی حکومت کی اربوں ڈالر کی پیشکش کو ٹھکرا کر اسے اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تو اس پر الزام لگایا گیا کہ ''اس میں جمہوری اصولوں کی کمی ہے''۔ ایک بین الاقوامی جائزے کے مطابق کسی بھی یورپی ملک میں —— امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے عراق پر حملے کو گیارہ فیصد عوام کی حمایت بھی حاصل نہ تھی۔ لیکن انگلینڈ، اٹلی، اسپین، ہنگری اور مشرقی یورپ کے دیگر ممالک کی حکومتوں کو بے حد سراہا گیا کہ انہوں نے اپنے عوام کے اکثریتی فیصلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے غیر قانونی اور بلا جواز حملے کی حمایت کی۔ غالباً یہی طریقہ جمہوری اصولوں کے عین مطابق تھا۔ اسے کیا کہا جائے —— نئی قسم کی

جمہوریت ــــ؟ (جیسے انگلینڈ کی لیبر حکومت) ان حکومتوں نے سستے داموں بک جانے کا جو مظاہرہ کیا ہے اس کے برعکس ان کے عوام نے ۱۵ فروری یعنی حملے سے ہفتوں قبل اپنے ضمیر کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا جو اس سے قبل دنیا والوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دس کروڑ سے زائد لوگوں نے اس غیر قانونی جنگ کے خلاف پانچوں براعظموں کی سڑکوں پر مارچ کیا اور مجھے یقین ہے کہ آپ لوگوں کی اکثریت بھی اس احتجاجی مارچ میں شامل ہوگی۔ انہیں ــــ نہیں نہیں ہمیں، انتہائی حقات سے رد کر دیا گیا۔ جب ان مظاہروں پر اظہار خیال کے لیے کہا گیا تو صدر بش نے فرمایا:

''ان مظاہروں کا مقصد کسی نہ کسی فیصلے پر مجبور کرنا ہوتا ہے۔ اور میں بھی ایک فیصلہ کرنے جا رہا ہوں۔ ایک ایسی پالیسی اپنانے جا رہا ہوں جو نمائندہ لوگوں کی ہے۔ اور یہ ایک اچھے لیڈر کا کام ہے کہ وہ اپنے عوام کی حفاظت کے لیے پالیسی بنائے''۔

پھر جمہوریت میں جو کچھ ہوا وہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ چنانچہ ''جمہوریت - جدید دنیا ــــ کی ''مقدس گائے'' ــــ آجکل بحران میں ہے۔ اور یہ بحران بہت ہی عاجزانہ قسم کا ہے اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جمہوریت آزاد دنیا کی بے بس اور بے کس بیسوا ہے جو ہر عزت، بے عزتی برداشت کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ اسے طرح طرح اور بھانت بھانت کے مطالبوں کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ جو جی چاہے استعمال کر لے، جب جی چاہے استعمال کر لے اور جس طرح جی چاہے استعمال کر لے۔ ہر وقت خدمت کے لیے حاضر ہے۔!

امریکی عوام دوسرے ملکوں کی آزادی کی قیمت اپنی آزادی گنوا کر ادا کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک عام امریکی کے لیے دوسرے ملک میں نئی جمہوریت کی قیمت اس کے اپنے ملک میں جمہوریت کی موت ہے۔

دہشت گردی کا شور ساری دنیا میں برپا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دہشت گرد اور بش انتظامیہ ایک ٹیم کی طرح مل کر کام کر رہے ہیں۔ دونوں ہی کسی بھی ملک کے عوام کو ان کی حکومتوں کی غلطیوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اجتماعی جرائم کے فلسفے پر یقین رکھتے ہیں اور اس کا فائدہ بھی مل جل کر اٹھاتے ہیں۔!

پس اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ اس بدقسمت جنگ کی قیمت کون ادا کر رہا ہے؟ ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کے لیے جانیں کون گنوا رہا ہے۔ لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ اس سے فائدہ کون اٹھائے گا؟ جنگ

کے بعد عراق کی تعمیر نو کے سوا رب ڈالر سے زائد مالیت کے ٹھیکوں سے فیض یاب کون ہوگا؟ کیا امریکہ کے غریب عوام، بے روزگار یا مریض کو اس سے فائدہ ہوگا؟ کیا امریکہ کے کالے اور لاطینی اس سے فائدہ اٹھائیں گے؟

جارج بش نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ عراق کی آزادی کا آپریشن عراقی تیل عوام کو لوٹانے کے لیے ہے! جی ہاں عراقی تیل عراقی عوام کو واپس کرنے کے لیے، لیکن بین الاقوامی دیوہیکل تیل کمپنیوں کے توسط سے۔ جیسے کہ بیک ٹل (Bechtel)، جیسے شیرون (Chervon)، جیسے ہالی برٹن (Halli Burtin) وغیرہ۔ یہ ایک چھوٹا سا سخت دائرہ ہے جو بڑی بڑی کمپنیوں، فوجی اور حکومتی لیڈروں کو آپس میں مربوط رکھتا ہے۔ یہ اعلیٰ سطح پر ایک ایسا ظالمانہ اتحاد ہے جس میں بے رحمی اور خود غرضی کو دخل ہے۔ کسی رنگ، نسل اور قومیت کا کوئی گزر نہیں۔

اس پر غور کیجیے۔ دفاعی پالیسی بورڈ (Defence Policy Board) ایک ایسا ادارہ ہے جس کا ہر ممبر حکومت نامزد کرتی ہے۔ اس بورڈ کا کام وزارت دفاع (پنٹاگون) کو دفاعی امور میں مشورے دینا ہے بلکہ اس کے لیے پالیسی بنانا ہے۔ اس کے ممبران کو انڈر سیکرٹری دفاع نامزد کرتا ہے اور رمزفیلڈ اس کی منظوری دیتا ہے۔ اس کی میٹنگیں اور کارروائی از حد خفیہ ہوتی ہے اور عوامی تبصرے کے لیے دستیاب نہیں۔

واشنگٹن میں موجود عوامی اتحاد کے ادارے Centre for Public Integrity نے انکشاف کیا ہے کہ دفاعی پالیسی بورڈ کے تیس میں سے نو ممبران ان کمپنیوں سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں ۲۰۰۱-۰۲ء کے درمیان ۶۷ ارب ڈالر کے دفاعی کنٹریکٹ دیے گئے۔ ان میں سے ایک جیک شیہان Jack Sheehan ہے جو بحری فواج کا ریٹائرڈ جنرل ہے اور بیک ٹل Bechtel نامی بین الاقوامی کمپنی کا سینئر نائب صدر ہے۔ اس کمپنی کا چیئرمین رائیلی بیک ٹل Riley Bechtel صدر کی برآمدی امور میں مشورہ دینے والی کونسل کا ممبر ہے۔ سابق وزیر خارجہ جارج بٹلر بھی بے چل گروپ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا ممبر ہے اور ساتھ ہی ''عراق کو آزادی دلانے والی کمیٹی'' کا چیئرمین بھی۔

ان حضرات سے نیویارک ٹائمز کے نمائندے نے جب سوال کیا کہ عراق میں ٹھیکوں کے سوال پر ان کا کسی سے اختلاف تو نہیں ہوگا، تو اس نے جواب دیا:

''مجھے نہیں معلوم کہ بیک ٹل کو اس جنگ سے کوئی مخصوص فائدہ ہوگا۔ لیکن اگر وہاں کرنے کے قابل کوئی کام ہوگا تو بیک ٹل اسے کرنے سے ہچکچائے گی نہیں ــــ''

اس ضمن میں عرض ہے کہ بیک ٹل کو عراق میں ۶۸ کروڑ ڈالر مالیت کے تعمیر نو کے ٹھیکے ملے ہیں۔ ایک سیاسی تجزیہ کرنے والے ادارے کے مطابق بیک ٹل نے ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کے انتخابات میں ری پبلکن پارٹی کے فنڈ میں تیرہ لاکھ ڈالر چندہ دیا تھا۔

جمہوریت کے نام پر جمہوریت کو پامال کرنے والی تمام تر امریکی چالاکیوں اور بے ایمانیوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو وہ مل کر بھی مجموعی طور پر امریکہ کے بنائے ہوئے دہشت گردی کے خلاف قانون کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔ یہ امریکی محبِّ وطن قانون (USA Patriot Act) جو ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۱ء میں پاس کیا گیا تھا۔ یہ جمہوریت کے تمام تر اصولوں کے خلاف بلکہ جمہوریت کے نام پر دھبہ ہے۔ اب یہ دوسرے ممالک کے لیے مثال بن گیا ہے اور امریکہ کے حواری دھمکائے اور خریدے گئے۔ دوسرے ممالک بھی اسے اپنے یہاں نافذ کر رہے ہیں۔ اسے ایوان نمائندگان نے ۷۹ کے مقابلے میں ۳۳۷ ووٹوں کی اکثریت سے پاس کیا۔ نیویارک ٹائمز اس کے متعلق لکھتا ہے:

''بیشتر قانون دانوں کا کہنا ہے کہ اس بل پر صحیح معنوں میں منصفانہ بحث ہونا ہی ناممکن ہے بلکہ اس کا پڑھا اور سمجھا جانا ہی مشکل ہے''۔

یہ رسوا کن ایکٹ ہمیں ایسے منظم، خود کار اور گھونٹ دینے والے عہد میں دھکیل دیتا ہے جہاں ہر لمحہ ہمیں اپنے بچاؤ کے لیے سوچنا اور ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ اس سے حکومت کو لوگوں کے ٹیلی فونوں، کمپیوٹروں کو کنٹرول کرنے اور لوگوں کی اندرون خانہ جاسوسی کرنے کا ایسا اختیار حاصل ہو جاتا ہے جس کا آج سے چند سال قبل تصور کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی قبول۔ یہ ایک امریکی خفیہ ایجنسی ایف بی آئی کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ کسی بھی اخبار یا رسالے کی تمام تر اشاعت کو ضبط کرے۔ کسی بھی لائبریری کے خریداری اور کتابوں کے ریکارڈ کو اپنی تحویل میں لے لے اور وہاں سے کتابیں حاصل کر کے پڑھنے والوں کے کوائف حاصل کر لے۔ نیز کتابوں کی دکانوں سے کتابوں کے خریداروں کے متعلق معلومات کرے۔ محض اس شبہ پر کہ یہ سب کسی بھی دہشت پسند گروہ کے افراد ہو سکتے ہیں۔ اس نے اظہار رائے اور مجرمانہ فعل کے درمیان

تفریق ختم کر کے رکھ دی ہے۔ ایسا خلا پیدا کر دیا ہے گویا عوامی جدوجہد قانون کی خلاف ورزی کا نام ہے۔

اس قانون کے تحت اب تک ہزاہا لوگ ''غیر قانونی سپاہی'' کے زیر الزام غیر معینہ مدت کے لیے بند ہو چکے ہیں۔ (بھارت میں ایسے لوگوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ اسرائیل میں پانچ ہزار فلسطینی جیلوں میں بند ہیں)۔ امریکہ میں جو ملک کے شہری نہیں ان کے تو سرے سے کوئی حقوق ہی نہیں۔ وہ تو اس طرح غائب کر دیے جاتے ہیں جس طرح چلی میں واشنگٹن کے پرانے دوست بدنام زمانہ صدر جنرل پنوشٹ کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ ایک ہزار سے زائد لوگ۔ جن میں اکثریت مسلمانوں اور مشرق وسطی کی ہے اس الزام میں بند ہیں۔ ان میں سے بعض کو قانونی امداد سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔

عراق کو مکمل طور پر فتح کر لینے کے بعد اب اسے مکمل آزادی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ اس آزادی کے اقدامات کی تفصیل سے پہلے ٹام بروکا (Tom Brokaw) کا ایک دلچسپ تبصرہ سن لیجیے۔ یہ حضرت امریکی ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے مشہور ترین میزبان ہیں۔ انہوں نے ان اقدامات کا خلاصہ اس طرح پیش کیا ہے:

> ''ایک چیز جو ہم کبھی نہ کرنا چاہیں گے وہ عراق کی مکمل تباہی ہے۔ کیونکہ چند دنوں میں یہ ملک ہماری اپنی ملکیت ہوگا۔ اب اس ملکیت کا فیصلہ ہو چکا ہے اور عراق جدید جمہوریت کے لیے تیار ہو چکا ہے۔ اب صرف اتنا کرنا ہے جتنا مشہور روسی رہنما لینن کہا کرتا تھا—— ''اب کیا کرنا ہے؟''

اب چند اقدامات بھی سن لیجیے۔ مشہور اخبار وال سٹریٹ جرنل بتاتا ہے کہ:

''بش انتظامیہ نے عراقی معیشت کو امریکی تناظر میں لانے کے لیے لمبے چوڑے پلان تیار کیے ہیں۔ عراقی آئین کو دوبارہ لکھا جا رہا ہے۔ اس کے تجارتی قوانین، ٹیکس قوانین اور پراپرٹی کے قوانین سب کو امریکی انداز کی سرمایہ دارانہ معیشت کے مطابق بنایا جا رہا ہے۔''

امریکہ کی بیرونی امداد کی ایجنسی US AID نے امریکی کمپنیوں کو دعوت دی ہے کہ وہ عراق کی تعمیر نو کے لیے سڑکوں کی تعمیر، آبی ذرائع، درسی کتب کی اشاعت اور ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون کے نیٹ ورک کے کنٹریکٹ کے لیے اپنی پیشکش سے مطلع کریں۔

حال ہی میں بش ثانی نے اعلان کیا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ امریکی کسان دنیا بھر کو غلہ فراہم کریں اس اعلان کے فوری بعد ڈان ایمس ٹٹر (Dan Amstuts) نامی شخص کو، جو کارگل (Cargill) نامی دنیا کی سب سے بڑی غلہ برآمد کرنے والی کمپنی کے سینئر ایگزیکٹو ہیں کو عراق میں زرعی تعمیر نو کا انچارج بنا دیا ہے۔ اس پر کیون واٹکنز (Kevin Watkins) جو آکس فام نامی کمپنی کے پالیسی ڈائریکٹر ہیں، نے دلچسپ تبصرہ کیا ہے، کہ:

''ڈان ایمس ٹٹر کو زرعی تعمیر نو کا انچارج مقرر کرنا ایسا ہی جیسے صدام حسین کو عراق میں انسانی حقوق کا کمیشن انچارج بنا دیا جائے۔''

جن دو حضرات کو عراقی تیل کے امور کا نگران بنایا گیا ہے وہ شیل (SHELL)، بی پی (BP) اور فلوئر (FLUOR) میں کام کر چکے ہیں۔ فلوئر وہ کمپنی ہے جس پر جنوبی افریقہ کے کالوں نے مقدمہ کر رکھا ہے کہ اس کمپنی نے نسلی امتیاز کے دنوں میں ان کا بے رحمی سے استحصال کیا تھا۔ شیل کے متعلق ہم سب جانتے ہیں کہ اس نے نائیجیریا میں اگونی Ogoni قبائل کی زمینوں پر کیا کیا تھا؟

کہا جاتا ہے کہ امریکی کارروائی کا موثر جواب دہشت گردی ہی ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم بھی کر لیں کہ اس وقت دنیا میں کوئی بھی ایسی روایتی فوج نہیں ہے جو امریکہ کی مہیب جنگی مشین کو للکار سکے۔ اس صورت میں دہشت گردانہ کارروائی کا بس ایک ہی نتیجہ برآمد ہوگا کہ امریکہ کو مزید موقع مل جائے گا جس کے لیے وہ بے چینی سے تلا بیٹھا ہے کہ وہ عراق پر اپنا قبضہ اور سخت کر دے۔ ساتھ ہی اس کے پڑوسی ملکوں کو بھی دھمکا سکے۔ کسی بھی دہشت گردانہ حملے کے بعد ہی -- آپ شرط لگا سکتے ہیں کہ ''پٹریاٹ ٹو'' پاس ہو کر لاگو ہو جائے گا اور لوگوں کی زندگی مزید خطرات کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔ امریکی جارحیت کے خلاف یہ دلیل دینا کہ اس سے دہشت گردانہ حملے بڑھ جائیں گے ایک بے معنی بات ہوگی۔ یہ تو بس اس طرح کی بات ہوگی کہ خرگوش کو دھمکی دی جائے کہ اسے ایک ایسے صحن میں پھینک دیا جائے گا جو گاجروں سے بھرا ہوگا۔ جس کسی نے پراجیکٹ برائے نئی امریکی صدی (Project for "The New American Century") پڑھ رکھا ہوگا وہ اس کی تصدیق بڑی آسانی سے کر سکے گا۔ گیارہ ستمبر کے واقعہ پر کانگریس کی کمیٹی نے جو رپورٹ تیار کی تھی اس میں انٹیلی جنس نے حملہ کے

خلاف مشورہ دیا تھا۔ امریکی حکومت نے یہ رپورٹ دبا دی تھی۔ اس ایک حرکت سے ہی امریکی حکومت کے عزائم کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ دہشت گردوں اور بش انتظامیہ کے عزائم ایک ہیں اور دونوں ایک ٹیم کی طرح کام کر رہے ہیں۔ یہ دونوں ہی عوام کو ان کی حکومتوں کے جرائم کا ذمہ دار قرار دے رہے ہیں۔ دونوں ہی اجتماعی گناہ اور اجتماعی سزا کے فلسفے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان دونوں کی کارروائیاں ایک دوسرے کے لیے خاصی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

امریکی حکومت نے عراق میں ننگی جارحیت کے ذریعے غیر مبہم انداز میں اپنی جنگی صلاحیتوں اور اس کی پہنچ کا مظاہرہ کر دیا ہے۔ اور اس انداز میں گویا اب اس کا مقابلہ کسی بھی ملک کے بس کی بات نہیں۔ انسانی نفسیات میں ایسی ننگی جارحیت وہی کر سکتا ہے جو بزدل ہو اور اپنے آپ کو خوفزدہ اور غیر محفوظ تصور کرتا ہو۔ قوموں کی نفسیات اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ پھر یہ نئی اور خود ساختہ شہنشاہیت تو پہلے سے ہی بزدل واقع ہوئی ہے۔ یہ اپنی سرحدوں کی حفاظت، سرحدوں پر گشت کر کے اور اپنے اسلحہ خانوں میں ایٹمی ہتھیار رکھ کر کر سکتی ہے۔ لیکن اس کی معیشت تو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے اور یہی وہ محاذ ہے جہاں اسے بآسانی شکست دی جا سکتی ہے۔ اس کی معیشت کی چوکیاں تو ہر جگہ کھلی ہوئی ہیں اور آسانی سے تباہ کی جا سکتی ہیں۔

انٹرنیٹ پر ابھی سے بہت سی سرکاری امریکی اور برطانوی کمپنیاں اور ادارے ان کے ساتھ ہی ان کی تیار کردہ اشیاء کی فہرستیں نمودار ہو رہی ہیں جن کے بائیکاٹ کی اپیل کی جاتی ہے۔ عام اہداف مثلاً کوکا کولا، پیپسی، میکڈونلڈ سے بڑھ کر سرکاری ایجنسیاں جیسے یو ایس ایڈ، برطانوی DFID، امریکی بنک مثلاً آر تھر اینڈ رسن، میرل لنچ، امریکن ایکسپریس کو بھی اس عوامی محاصرہ اور بائیکاٹ میں آنا چاہیے۔ ان فہرستوں میں ضرورت کے مطابق اضافے ہوتے رہنے چاہییں، جو نہ صرف اس شہنشاہیت سے عالمی نفرت کا اظہار کریں بلکہ اس کی صحیح سمت میں راہنمائی بھی کر سکیں۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ عالمی تجارت Corporate Globalisation کا حال ہی میں چھوڑا ہوا شوشا کتنی جلدی کس قدر اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ایسے شوشوں کو ناکام بنانا ہوگا۔ یہ تصور کہ ہم شہنشاہیت سے براہ راست ٹکر لے سکیں گے محض سادہ لوحی ہوگی۔ ہاں ہماری حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ

شہنشاہیت کے مختلف اجزا کو لیں اور انہیں ایک ایک کر کے کمزور کرتے جائیں۔ یاد رکھیں کوئی بھی ہدف چھوٹا یا معمولی نہیں ہوتا اور کوئی بھی فتح معمولی نہیں ہوتی۔ اس حکمت عملی سے ہم شہنشاہیت اور اس کے ہمنواؤں کی طرف غریب عوام پر معاشی پابندیاں لگانے کے تصور کو بالکل الٹ سکتے ہیں۔ ہم ہر اس ادارے پر عوامی معاشی پابندیاں لگا سکتے ہیں جسے عراق میں تعمیر نو کا ٹھیکہ ملا ہو۔ ان کا مال خریدنے سے انکار کر دیا جائے، ان سے تعلقات منقطع کر لیے جائیں۔ جس طرح کچھ عرصہ قبل نسلی امتیاز برتنے والے ممالک کے ساتھ کیا گیا تھا اور وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان میں ہر ایک کا نام بتایا جائے، اس کے تیار کردہ مال کی تفصیل بتائی جائے اور پھر اس کا اس طرح بائیکاٹ کیا جائے کہ وہ مارکیٹ سے ہی خارج ہو جائے۔ یہ ہماری طرف سے ''ضرب اور حیرت'' کا صحیح معنوں میں جواب ہوگا اور ایک عظیم ابتدا ہوگی۔

اس ضمن میں دوسرا فوری طور پر کرنے والا کام ان کے پروپیگنڈوں کا مؤثر جواب دینا ہے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے ٹیلی وژن اسٹیشن، ریڈیو اور اخبارات کا سلسلہ قائم کرنا ہوگا تاکہ کسی بھی جھوٹ کا فوری جواب دیا جا سکے۔

جمہوریت کی بحالی کی جنگ کسی طرح بھی آسان نہیں ہوگی۔ ہماری آزادیاں ہمیں کسی بھی حکومت نے خود بخود عطا نہیں کیں اور نہ ہی ہمیں خیرات میں ملی ہیں۔ ان کے لیے باقاعدہ جدوجہد کی گئی ہے۔ اگر ایک دفعہ ہم انہیں گنوا بیٹھے تو پھر ان کو کسی انقلاب کے بعد ہی حاصل کیا جا سکے گا۔ یہ ایک ایسی جنگ ہوگی جو ملکوں اور براعظموں میں لڑی جائے گی۔ اس کو کسی ملک یا قوم کی سرحدوں کے اندر قید نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن اگر اسے کامیاب ہونا ہے تو اسے اسی ملک سے شروع کرنا پڑے گا یعنی امریکہ سے۔ ایک ہی ادارہ امریکی حکومت سے زیادہ طاقت ور ہے اور وہ ہے امریکی معاشرہ۔ امریکی عوام، جو اپنی حکومت کے سرکش گھوڑے کو لگام دے سکتے ہیں باقی ہم سب لوگ تو غلام ممالک کی رعایا ہیں۔ لیکن ہم کسی طرح بھی کمزور نہیں ہیں کیونکہ آپ کے پاس اتحاد کی طاقت ہے۔ آپ شاہی محل اور شاہی ایوانوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ شہنشاہیت کی فتح آپ کے نام لکھی جا سکتی ہے اور آپ اسے رد کر سکتے ہیں۔ آپ اس کے لیے جنگ کرنے سے انکار کر سکتے ہیں۔ ان کے میزائلوں کو ان کے اڈوں تک پہنچانے سے انکار کر سکتے ہیں۔ ان کا جھنڈا لہرانے سے انکار کر سکتے ہیں۔ ان کی فاتحانہ پریڈ میں شرکت سے انکار کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس